Vol.5 No.1 2022

ISSN Online: 2709-7625

ISSN Print: 2709-7617

اردوافسانہ۔ایک صدی کا قصہ"کا تجزیاتی مطالعہ "

A CRITICAL STUDY OF‘URDU AFSANA. AIKSADI KA QISA’

۱۔رحمان سرور باجوہ

پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ اردو، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور

۲۔ڈاکٹر طاہر عباس

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، اسلامیہ یونی ورسٹی، بہاول پور

۳۔ڈاکٹر واصف اقبال

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، اسلامیہ یونی ورسٹی، بہاول پور

Abstract

Anwar Ahmed is distinguished and esteemed critic of Urdu fiction. This article shows the study of his remarkable book, “Urdu Afsana – AikSadi ka Qisa”. He is generally known as progressive critic of Urdu. He expressed the history of Urdu short story in the form of tradition. Basically this book is divided into two parts; tradition of Praim Chand and realization of tradition. The author has explored and criticized the art of short story of two hundred and fortyfive Urdu short story writers. In this article first of all an eye bird view is taken of his book. Secondly, principles of research which the author exercises in this book are conversed. Thirdly author's research along with analytical process is separately observed. Lastly being author is progressive critic his progressive criticism is deeply studied in this article.

Keywords: Urdu Short Story, Progress Movement, Languge and Litrature, Research, History, Tridition, Fiction, Critical Overview.

کلیدی الفاظ: اردوافسانہ، ترقی پسند تحریک، زبان و ادب، تحقیق، روایت، تاریخ، افسانوی ادب، تنقیدی جائزہ

انوار احمد صاحب اردو فکشن کے ممتاز نقاد ہیں۔اس تحقیقی مطالعے میں ان کی قابلِ ذکر کتاب 'اردوافسانہ۔ایک صدی کا قصہ' کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا اردو کے اہم ترقی پسند نقادوں میں شمار ہوتا۔انھوں نے اردو افسانے کی تاریخ کو روایت کی شکل میں بیان کیا ہے۔بنیادی طور پر ان کی یہ تصنیف دو حصوں میں مشتمل ہے؛ پریم چند کی روایت اور روایت کا حاصل۔ مصنف نے اس کتاب میں دو سو پنتالیس افسانہ لکھنے والوں کے فن کو جانچا اور پرکھا ہے۔اس مقالے میں سب سے پہلے پوری کتاب کا مختصراً جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے نمبر پر تحقیق کے ان اصولوں کو مضمون میں جگہ دی گئی ہے جن کو مصنف نے اپنی اس تصنیف میں اختیار کیا ہے۔ تیسرے نمبر پر مصنف کی تحقیق کو تجزیاتی عمل کے ہمراہ واقفیت حاصل کرنے کی غرض سے دیکھا گیا ہے۔ آخر میں ڈاکٹر صاحب کی تنقید کو بطور ترقی پسند نقاد کے گہرا مشاہدہ کیا گیا ہے۔

Vol.5 No.1 2022
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

انسان کی دلچسپی ابتداءہی سے قصہ سننے اور قصہ سنانے میں ہے۔ عندالضرورت ابتدا میں داستان اور لوک کہانی وجود میں آئی۔اردو افسانے سے پہلے معاشرتی اور اصلاحی ناول اردو ادب میں متعارف ہوا لیکن جیسے جیسے ہندوستانی خطہ صنعتی دور میں داخل ہوا چھوٹے اور عام طبقے کو سرمایہ دارانہ اور جاگیر دارانہ سماج کے استحصال کا احساس ہونے لگا انسان کی مصروفیت میں بھی اضافہ ہونے لگا۔فارغ وقت کی کمی کی وجہ سے ناول کی جگہ افسانے نے لے لی۔اردو افسانے نے اپنے آغاز سے اب تک بے مثال ترقی کی ہے۔اردو میں بہت سے افسانہ نویسوں کے نام لیے جاسکتے ہیں جن کے افسانوں کو دنیا کے بہترین افسانوں کے مقابل پیش کیا جاسکتا ہے۔اردو افسانے کے سو سالوں کے دوران کہانی کاروں نے رومانیت،حقیقت نگاری،اور جدیدیت کے رجحانات کے تحت اردو افسانے کے دامن کو وسعت دی ہے۔جتنے بہتر انداز میں ہمارے معاشرتی اور سیاسی حالات افسانے کا موضوع بنے ہیں کسی دوسری صنف ادب میں یہ خوبی مشکل ہی سے نظر آتی ہے۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری اس حقیقت کا ادراک کرتے ہوئے سمجھتے ہیں کہ اردو افسانہ ناول کی طرح مغرب کی دین ہے لیکن یہ اتنی تیزی سے اردو ادب میں پروان چڑھا کہ کچھ ہی عرصے میں یہ تمام تخلیقی اصناف پر حاوی ہو گیا۔ (۱)اردو افسانے سے متعلق ڈاکٹر صاحب کی یہ ایک اہم کتاب ہے جس کے کئی ایڈیشن اب تک قارئین کی نظر ہو چکے ہیں۔انہوں نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے اردو افسانہ کو اپنا موضوع بنایا تھا۔ انکے مقالے کا عنوان ''اردو مختصر افسانہ: اپنے سیاسی وسماجی تناظر میں '' تھا جو انہوں نے ۱۹۸۴ء میں بہاءالدین ذکریا یونی ورسٹی،ملتان میں اپنی ادبی تحقیق کے دوران لکھا۔ڈاکٹر صاحب کی اس کتاب کو طلبا واساتذہ اور اردو فکشن کے ناقدین وماہرین بہت اہمیت دیتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کتاب کے آغاز میں اپنی اس تصنیف کے وقوع میں آنے کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہیں کہ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ان کے ڈاکٹریٹ کے مقالے کی صورت میں ہے جس کو ۱۹۸۸ء میں بیکن بکس،ملتان نے ''اردو افسانہ۔تحقیق وتنقید'' کے عنوان سے شائع کیا۔لیکن پھر اس کتاب پر نظر ثانی کر کے اسے ''اردو افسانہ۔ایک صدی کا قصہ'' کا نام دیا گیا۔کتاب ہذا کی دوسری اشاعت مقتدرہ قومی زبان کے تعاون سے عمل میں آئی۔دوسرے ایڈیشن میں ۱۵۳ افسانہ نگاروں کے فن پر بات کی گئی۔ڈاکٹر صاحب کی اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن بھی ''اردو افسانہ۔ایک صدی کا قصہ'' کے نام سے چھپ کر مشتہر ہوا جسے کتاب نگر ملتان نے شائع کیا۔اس ایڈیشن میں مزید ۹۵ افسانہ نگاروں کے فن پر چھان پھٹک کی گئی۔کتاب کی اشاعت کے مقاصد اور اس کے مختلف ایڈیشنوں کا حوالہ دینے کے بعد انوار احمد صاحب قصے کے فن پر رابرٹ بوائنٹنکے مقولے کے مطابق اقرار کرتے ہیں کہ کہانیاں ظہور پذیر نہیں ہوتیں انھیں نثری کاوش کا درجہ دینا پڑتا ہے۔(۲)

ڈاکٹر صاحب کہانی یا قصے کو افسانے کے معانی میں لیتے ہیں اور مختلف مغربی مفکرین کی آراء کا جائزہ پیش کر کے افسانے کی فنی حقیقت جاننے کے لیے کچھ قواعد م ق رر ک رت ے ہ ی ں۔ م ث ل اَ ف س ان لکھا جاتا ہے یہ کہانی کی صورت میں ہوں دور جدید نے اپنائی،ناول کے مقابل اس کا پھیلاؤ مقید نہیں تو اختصار ضرور رکھتا ہے اور ناول کے بر خلاف افسانے میں ایک خیال،ایک واقع،ایک احساس یا تجربے کو پیش کیا جاتا ہے۔انھوں نے قصے کے فن میں کردار نگاری،رمزی لہجہ،افسانے کے پلاٹ وہیت،افسانے کے آغاز اور اختتام پر مختلف ناقدین فن کی آراء کو یکجا کیا ہے۔وہ سمجھتے ہیں کہ افسانے کی کتابی تعریفوں کے مقابل عظیم تخلیق کاروں کے فقرے زیادہ بلاغت رکھتے ہیں۔اس تناظر میں وہ گابریلر کیوز کو حق بجانب ٹھہراتے ہیں:

> ''جب یونس نے اپنی بیوی کو بتایا کہ میں تین دن مچھلی کے پیٹ میں رہا ہوں تو اس نے اُسے ایسے
> دیکھا جیسے وہ کہانی سُنا رہا ہو۔''(۳)

انوار احمد صاحب قصے کے فن میں افسانے کی تکنیکس کا بھی تذکرہ کرنے کے ساتھ ان تکنیکس کی آفادیت کا اقرار کرتے ہیں کہ ان کے استعمال سے افسانے میں داخلی تجربہ اور معانی کیتوسیع ہوتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی اس تصنیف کے آغاز م ی ں اردو اف س ان ے ک ی ت اری خ ک و م خ ت ص راَ ب ی ان ک ی اہ ے اور اس ت اری خ م ی ں رون م ا ہ ون ے طرف اشارہ کیا ہے۔یہ سوال مصنف کو پریشان کرتا ہے کہ اردو افسانے میں ''تحریک پاکستان'' کا موضوع کیوں اپنی توجہ حاصل نہ کر سکا؟اور پھر ڈاکٹر صاحب نے اس الجھن کو سلجھانے کی جانب پیش رفت کرتے ہوئے جہاں اس کی بنیادی وجہ ترقی پسند تحریک کو قرار دیا ہے کہ اس تحریک کی بدولت روشن خیالی اور انسان دوستی ہمارے ادیبوں کی فکر میں حاوی رہی وہاں مسلم لیگ کو بھی مورد الزام ٹھہرایا ہے جس نے پاکستان کی تحریک کو کامیابی سے چلایا لیکن

Vol.5 No.1 2022
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

ثقافتی اور ادبی محاذ پر کام کرنے کی ضرورت کو محسوس نہ کیا۔ڈاکٹر صاحب نے اردو افسانے کو سیاسی و سماجی تناظر کو واضح کرنے میں اہم حربہ خیال کیا ہے جیسا کہ وہ لکھتے ہیں:

"اس مختصر سی عمر میں اردو افسانے نے کیا نہیں دیکھا، آشوب زیست کا کون سا ذائقہ نہیں چکھا اور جبر و استحصال کے کس حربے کا مشاہدہ نہیں کیا۔اس لیے میرے خیال میں مختصر افسانہ ادب کی تمام اصناف پر اس لیے فوقیت رکھتا ہے کہ اس میں ہماری قومی تاریخ کی ایک دستاویز بننے کی اہلیت بھی ہے اور فنی رچاؤ کے وہ تمام انداز بھی جو کسی صنف ادب کو قلیلا لمعیاد بننے سے بچا لیتے ہیں۔"(۴)

ہم عصر ناقدین جیسا کہ ڈاکٹر وزیر آغا، شمس الرحمٰن فاروقی اور گوپی چند نارنگ کے برخلاف وہ تقسیم ہند کے بعد کی صورتحال کو ایک مخصوص تناظر میں دیکھتے ہیں اور یہ تناظر پاکستان میں قائم نامنصفانہ سرمایہ دارانہ نظام ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے دوسرے ایڈیشن کی طرح تیسرے ایڈیشن میں بھی اپنی تحقیق کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔یعنی روایت، روایت کا حاصل"اپنی اس تصنیف کے تیسرے ایڈیشن میں اردو افسانے کی تاریخ کو زیادہ موثر انداز میں قلم بند کیا ہے۔ڈاکٹر صاحب نے اپنی تحقیق کے پہلے حصے میں پریم چند کی روایت کو مثالیت اور سماجی واقعیت نگاری کہا ہے اور پریم چند کی روایت کے اہم مقلد افسانہ نگاروں میں سدرشن، اوپندر ناتھ اشک، علی عباس حسینی، اختر اورینوی، اعظم کریوی، سہیل عظیم آبادی، ہنس راج رہبر، اختر انصاری، اور کشمیری لال ذاکر کو شامل کیا ہے۔اس فہرست کے آخری چار نام تیسرے ایڈیشن میں پہلی بار ڈاکٹر صاحب کی توجہ کا مرکز بنے ہیں۔کتاب کے پہلے حصے کا دوسرا باب ترقی پسند افسانہ نگاروں سے متعلق ہے۔انوار احمد صاحب اس باب کا آغاز اردو ادب میں ایک رجحان ساز بغاوت یعنی سجاد ظہیر اور رسالے انگارے کے مندرجات سے کرتے ہیں۔اس رسالے میں لکھنے والے دوسرے دو نام رشید جہاں اور احمد علی ہیں۔ترقی پسندی کی فکر میں ڈوبے ہوئے افسانہ نویسوں میں ڈاکٹر صاحب نے کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، عصمت چغتائی، حیات اللہ انصاری، خواجہ احمد عباس، اختر حسین رائے پوری، خدیجہ مستور، حاجرہ مسرور، شوکت صدیقی، ابراہیم جلیس، دیوندر اسر، اختر جمال، سید انور، محمود احمد قاضی، منصور قیصر، خالد فتح محمد، صلاح الدین حیدر، خالد سعید، حمید اختر، احتشام حسین، انور عظیم اور سعیدہ گزدر کو شامل کیا ہے۔اس فہرست میں آخری چار نام تیسرے ایڈیشن میں پہلی بار سامنے آئے ہیں۔

مذکورہ کتاب کے پہلے حصے کا تیسرا باب رومانوی افسانہ نگاروں کے فن پر تحقیق و تفتیش پر مشتمل ہے۔رومانوی افسانہ نگاروں کی فہرست میں حجاب امتیاز، میرزا ادیب، نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری، محمد علی ردولوی، سید عابد علی عابد، شمس آغا، مسز عبدالقادر، عندلیب شادانی، اے حمید، آغا بابر، شفیق الرحمان، محمد احسن فاروقی، ابوالفضل صدیقی، غلام الثقلین نقوی، فرخندہ لودھی، غلام محمد، انور خان، انور نسیم، امراؤ طارق، قیس رام پوری، عاصی کرنالی، شبنم شکیل اور نورالہدیٰ سید شامل ہیں۔اس فہرست کے بھی آخری چار نام پہلی بار مصنف کی نظر میں آئے ہیں۔ڈاکٹر صاحب نے منٹو کی روایت میں لکھنے والے افسانہ نویسوں کو الگ سے ایک جگہ جمع کیا ہے۔منٹو کی روایت میں لکھنے والوں میں سعادت حسن منٹو، واجدہ تبسم، رحمان مذنب اور احمد داود شامل ہیں۔ڈاکٹر انوار صاحب نے روایتی طور پر لکھنے والوں میں چند ایسے کہانی کاروں کو بھی شامل کیا ہے جو اپنے ایک یادگار افسانے کا خالق ہونے کی وجہ سے شہرت پا گئے۔ان میں قاضی عبدالغفار، اور رشید اختر ندوی کے علاوہ شیورانی، جاوید جعفری، رضیہ سجاد ظہیر اور سید خلیل احمد ایسے نام ہیں جو تیسرے ایڈیشن میں پہلی بار شامل کیا گیا۔

اردو افسانہ۔ایک صدی کا قصہ کے دوسرے حصے کے تین ابواب ہیں: (ا) رفتگاں، وہ بڑے تخلیق کار جو اب ہمارے درمیاں نہیں (ب) موجودہ افسانہ نگاروں میں بڑے نام، آخری باب' ایک بیانیہ اردو کے ۷۳ افسانہ نگاروں کے لیے 'روایت کے حاصل کے پہلے باب میں یعنی رفتگان میں غلام عباس، عزیز احمد، راجندر سنگھ بیدی، قراۃ العین حیدر، انتظار حسین، نیر مسعود، اشفاق احمد، خالد اختر، بلونت سنگھ، دیوندر ستیار تھی، حسن عسکری، رفیق حسین، رام لعل، ممتاز مفتی، عبداللہ حسین، محمد منشایاد، احمد جاوید، جوگندر پال، بانو قدسیہ، جمیلہ ہاشمی، حسن رضا گردیزی، بلراج مینرا، سریندر

پرکاش، ضمیر الدین احمد، قدرت اللہ شہاب، ممتاز شریں، عرش صدیقی، انیس ناگی، منیر احمد شیخ، عظیم بیگ چغتائی، غیاث احمد گدی، احمد ہمیش، ابن سعید، مہندر ناتھ، جاوید شاہین اور مصطفی کریم ہیں۔اس فہرست کے بھی آخری سات نام پہلی بار کتاب کے تیسرے ایڈیشن میں متعارف کرائے گئے ہیں۔ روایت کے حاصل کے باب الثانیمیں ان افسانہ نگاروں کے فن پر بات کی ہے جو موجودہ عہد کے بڑے کہانی لکھنے والوں میں شمار ہوتے ہیں۔اس فہرست میں اسد محمد خان، حسن منظر، رشید امجد، جیلانی بانو، انور سجاد، خالدہ حسین، مسعود اشعر، اکرام اللہ، سمیع آہوجا، مرزا حامد بیگ، یونس جاوید، علی تنہا، ڈاکٹر سلیم اختر، مظہر الاسلام، مسعود مفتی، رضیہ فصیح احمد، شمس الرحمان فاروقی، طارق محمود، زاہدہ حنا، سلام بن رازق، پروین عاطف، فہمیدہ ریاض، آصف فرخی، نیلو فر اقبال، طاہرہ اقبال، شہناز شورو، رضا علی عابدی، گلزار، حمرا خلیق، حمید شاہد، انور زاہدی، مرزا اطہر بیگ، عاصم بٹ، صباحت مشتاق، خالد محمود خان، راشدہ قاضی اور لیاقت علی شامل ہیں۔تاہم مستنصر حسین تارڑ، اقبال مجید، محمد حامد سراج، فاطمہ حسن، اصغر ندیم سید، علی اکبر ناطق، مبین مرزا، فریدہ حفیظ، شکیلہ رفیق، ناصر عباس نیر، نجم الدین احمد، منزہ احتشام گوندل، آغا گل، نیئر اقبال علوی، دردانہ نوشین، صائمہ ارم، خواجہ اعجاز احمد بٹ، انجینئر مالک اُشتر، راحت وفا اور شاہد رضوان ایسے نام ہیں جن سے ' اردو افسانہ۔ایک صدی کا قصہ ' کا قاری پہلی بار متعارف ہوتا ہے۔

کتاب کا آخری باب 'ایک بیانیہ اردو کے ۴۳ افسانہ نگاروں کے لیے ' ہے اس باب کو ذرا ترمیم سے نیا نام دیا گیا ہے دوسرے ایڈیشن میں اس باب کو 'ازالے کے لیے ایک بیانہ (پچاس افسانہ نگار) ' سے موسوم کیا گیا تھا۔ اس ب اب م ی ں ڈاک ٹ ر ص اح ب ن ے م ا ن ئ ے ل ک ھ ن ے وال وں ک ے باخت کیے ہیں۔ میں درج ذیل بیشتر نام وہ ہیں جو سابقہ ایڈیشن میں بھی "ازالہ" کے لیے شامل کیے گئے تھے۔جیسا کہ ظہیر بابر، آغا سہیل، ام عمارہ، اے خیام، علی حیدر ملک، ذکا الرحمٰن، فاروق خالد، حفیظ احسن، فرحت پروین، اعجاز راہی، ناصر بغدادی، طاہر محمد خان، عنائیت الہی، گلزار ملک، شیر شاہ سید، شیخ سعید، فردوس انور قاضی، احمد اعجاز بھلر، عمران اقبال، ساحر شفیق اور غزالہ خاکوانی کے نام شامل ہیں، اسی فہرست میں ڈاکٹر صاحب نے کچھ نئے نام جیسے کہ بیگم شائستہ اکرام اللہ، آمنہ نازلی بیگم، بلقیس عابد علی، جسٹس حازق الخیری، افتخار جالب، قاضی امر جلیل، سائرہ ہاشمی، اسلم سراج الدین، وقار بن الہی، عبد الصمد، مظہر الزماں خان، ایم اے شمشاد، حنیف چودھری، حفیظ خان، جمیل احمد عدیل، عفرا بخاری، نند کشور وکرم، نگہت حسن، رخسانہ صولت، نجمہ سہیل، عذرا عباس، غلام فرید کاٹھیا، رئیس فاطمہ، ترنم ریاض، خالد طور، ایزد عزیز، محمد نجم الحسن رضوی، امجد طفیل، نگہت سلیم، بشریٰ اعجاز، عطیہ سید، غافر شہزاد، لبابہ عباس، محمد امین الدین، محمد جمیل چوخیل، امان اللہ خان، سید گلزار حسین، بلال حسن منٹو، شہناز حیدر نقوی، اورنگزیب، علی محسن، اسرار احمد شاکر، امرت مراد، محمد جواد، مزمل بھٹی، جاوید اصغر، ریاض قدیر، اسلم سحابہاشمی، حبیب موہانا اور قرب عباس شامل کیے ہیں۔

دوسرے ایڈیشن کے کچھ افسانہ نگاروں کے نام ایسے بھی ہیں جو ' ازالہ ' کے طور پر شامل تھے لیکن اب یہ نام ڈاکٹر صاحب کے نزدیک وقعت اختیار کر گئے ہیں۔جیسا کہ اختر اوربنوی، منصور قیصر، خالد فتح محمد، صلاح الدین حیدر، شمس آغا، انور خان، انور نسیم، رحمان مذنب، قاضی عبد الغفار، سید جاوید اختر، سید قاسم محمود، انیس ناگی، منیر احمد شیخ، حسن گردیزی، یونس جاوید، فہمیدہ ریاض، شہناز شورو، محمد حمید شاہد، مرزا اظہر بیگ، عاصم بٹ، صباحت مشتاق، خالد محمود خان، لیاقت علی، راشدہ قاضی شامل ہیں۔

ڈاکٹر انوار احمد صاحب اپنی اس تصنیف میں بے تکلفی سے افسانہ نگاروں کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہیں۔انھوں نے بعض افسانہ نگاروں کی تعریف کی ہے بعض پر اعتراضات کیے ہیں اور بعض پر طنز بھی۔ڈاکٹر صاحب کی تحریر کی یہ خوبی ہے کہ وہ ہر افسانہ نگار کے فن کا احوال ابتدا ہی سے اس قدر دلچسپ اور جاندار طریقے سے کرتے ہیں کہ قاری ان کے اسلوب نگارش کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔اس تصنیف میں اُن کے تمام مضامین کے عنوانات افسانوی نوعیت کے ہیں۔یہ عنوان افسانہ نگاروں کے کردار اوران کے فن کے عین مطابق معلوم ہوتے ہیں۔ م ث ل اَ ان ور ع ظ ی م : لڑھکتی چٹان کو سہارنے والا، ابراہیم جلیس: کڑوے لہجے کا میٹھا فنکار، نیاز فتح پوری: نازوالے ہی نیاز کو جانیں، سعادت حسن منٹو: برصغیر کا تخلیق ضمیر، شاہی محلے کا رازداں: رحمان مذنب، بشر کی کمزور عظمت کا نواگر: غلام عباس، بلونت سنگھ: اردو افسانے کا پیارا جگا، بھلائی گئی زندگی کی بے پایاں کشش اور منشایاد، بانو قدسیہ: بابا صاحبا کی صاحباں، پکڑے نہ جانے والا پرندہ غیاث احمد گدی، اسد محمد خان: افسانہ نگر کا جادوگر، خالدہ حسین اور وہی کشفِ ذات اور وہی کشفِ ذات کی آرزو، سمیع

Vol.5 No.1 2022
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

آہو جا: آدرش کے لیے تشدد سہنے اور دینے والا افسانہ نگار، تہذیب کا مفسر مگر عوامی قوت کا ترساں: شمس الرحمن فاروقی، ملکانیوں کی وراثت سے منحرف: طاہرہ اقبال، ایک خواب پسند لیاقت علی، گندھارا تہذیب کا ثناخواں: انجینئر مالک اُشتر وغیرہ۔

ڈاکٹر انوار احمد منٹو، غلام عباس، انتظار حسین، حسن منظر، اسد محمد خان، نیر مسعود، طاہرہ اقبال کی افسانہ نگاری میں خصوصی دلچسپی رکھتے ہیں۔ منٹو کو اس کی حق گوئی اور ریاکاری کے خلاف آواز اُٹھانے کی وجہ سے بہت پسند کرتے ہیں۔ وہ آج کے خوف زدہ افسانہ نگار کو آزادی اظہار رائے کا سبق یاد دلانے کے لیے منٹو کی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں۔ منٹو کے فن سے قاری کو ان الفاظ سے متعارف کراتے ہیں:

"کہانی کار جس زمین پر بیٹھ کر لوگوں کو قصہ سناتا ہے۔ اس کے لیے اچھے موسم کا خواب اور آرزو اس کی آنکھ اور دلمیں ہوتی ہے مگر کوئی صرف مدہوش کرتا ہے، کوئی جھنجوڑتا ہے کہ اچھی تعبیریں رتجگوں کے عوض ملتی ہیں اور اردو افسانے میں جب بھی حق انصاف کی خاطر بے باکی اور مزاحمت ریاکاری کے خلاف للکار، انسانیت سے لگاؤ کے بلند آہنگ اقرار اور آزادی اظہار کا ذکر ہوتا ہے سعادت حسن منٹو کا حوالہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ بلکہ میں اگر کہوں کہ اردو افسانے کو منٹو ہینے یہ لہجہ سکھایا تو مبالغہ نہ ہو گا۔"(۵)

غلام عباس کی افسانہ نگاری میں معاشرے میں پائی جانے والی منافقت اور ریاکار یکوڈاکٹر صاحبمنفرد طور پر دریافت کرتے ہیں کہوہ معاشرے میں پائے جانے والے تضادات کو نمایاں کر کے خود لاتعلقی سے مسکرانے لگتے ہیں اور ان کی مسکراہٹ میں زہر خند سے زیادہ طعن کا عنصر زیادہ ہوتا ہے۔ انتظار حسینکے افسانوں میں انوار صاحب ایک طرف ثقافت کے وجود سے کٹنے کو اور دوسری طرف ان کے تاریخ و تہذیب کے تناظر میں اظہار و ابلاغ کو بہت اہم جانتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب حسن منظر کی افسانہ نگاری میں پانچ باتوں کو یوں بیان کرتے ہیں جیسے کمرہ جماعت میں ایک استاد اپنے شاگردوں کو سمجھانے کے لیے اپنے ہاتھ کی انگلیوں کو فرداً فرداً اُٹھا کر کسی چیز کی اہمیت کو باور کراتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب سمجھتے ہیں کہ ان کے افسانوں کی نوعیت سوانحیہے، ان کا اظہار تہذیبی ہے، وہ سماج میں پائی جانے والی احساس محرومی کو نہیں بھولتے، عورت کے مسائل کو مذہبی جبر اور سماجی عدم امتیاز کے حوالے سے بیان کرتے ہیں اور شخصیت میں عالمگیریت کا عنصر ہونے کے باوجود ان کے افسانوں میں مہاجریت سے زیادہ مہاجریت کا احساس ملتا ہے۔ انوار احمد صاحب نیر مسعود کی تخلیقی نثر کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ نیر مسعود کے افسانوں میں نہ صرف واحد متکلم کی تکنیک کو دریافت کرتے ہیں بلکہ واحد متکلم کو ان کے وجود کا مثنیٰ قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اسد محمد خان کے مذہبی اور متصوفانہ تجربے کو ان کی تخلیقیت کا بنیادی جزو مانتے ہیں، لیکن ان کا یہ داخلی تجربہ ان کو مذہبی جبر اور استحصال کے خلاف قلم اُٹھانے سے نہیں روکتا۔ ڈاکٹر صاحب اسد محمد خان کی افسانہ نگاری سے متعلق مزید انکشاف کرتے ہیں کہ وہ انسانی فطرت کو سمجھنے کے لیے تاریخ سے معنی کشید کرتے ہیں۔ طاہرہ اقبال کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس کے تجربے اور احساس کا ماخذ اور امین پہلے اس کے کان ہیں، پھر آنکھیں اور ظاہر ہے کہ دل دل اور زبان تو ہیں ہی، مگر اُس کی یادداشت میں ایسی ملکانی ہے جس کے پاس لفظوں، محاوروں فطری محسوسات کی بلاغت یعنی گالیوں کا بے پناہ ذخیرہ ہے۔"(۶)

ڈاکٹر صاحب نے کچھ ایسے افسانہ نگاروں کے بھی تذکرہ کیا ہے جن کے کسی ایک افسانے نے انہیں متوجہ کیا جیسے کہ جاوید جعفری کا افسانہ "جاگے پاک پروردگار" رضیہ سجاد ظہیر کا "ایک یاد" حیات اللہ انصاری کا "آخری کوشش" جاوید جعفری کے افسانے "جاگے پاک پروردگار" سے خصوصی رغبت کی وجہ اس افسانے کی فضا، اور منفرد اسلوب ہے۔ جبر و استحصال کے خلاف یہ افسانہ تمثیلی پیرائے میں لکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب تقسیم کے بعد لکھے جانے والے اس افسانے کو بہترین افسانوں میں شمار کرتے ہیں۔ رضیہ سجاد ظہیر کے افسانے "ایک یاد" کو رابندر ناتھ ٹیگور کے افسانے "کابلیوالا" کے پائے کا افسانہ سمجھتے ہیں۔ حیات اللہ انصاری کی "آخری کوشش" کی فضا ڈاکٹر صاحب کو پریم چند کی کہانی "کفن" کی معنوی توسیع دکھائی دیتی ہے مزید یہ افسانہ اپنی بے رحم واقعیت نگاری سے ڈاکٹر صاحب کی توجہ حاصل کر لیتا ہے۔ اس افسانے سے متعلق ڈاکٹر صاحب تحریر کرتے ہیں:

Vol.5 No.1 2022
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

"حقیقت یہ ہے کہ حیات اللہ کے نصیب میں ایک ایسا بڑا افسانہ لکھنا تھا جس نے اُسے اردو افسانے کی روایت میں نمایاں مقام دلایا، حالاں کہ اس کے بعد بھی انھوں نے بہت کچھ لکھا، زیادہ بھرپور سیاسی اور فکری زندگی گزاری دو ایک ناول بھی لکھے مگر تخلیقی سطح پر اُن کی وہی کوشش آخری کوشش ہی رہی" (۷)

ڈاکٹر انوار احمد بنیادی طور پر ایک نقاد ہیں اور خاص طور پر افسانے کی تنقید میں انہیں ایک منفرد حیثیت حاصل رہی ہے۔ اردو افسانہ کی تنقید پر بڑے نقادوں کے مضامین پڑھے جائیں تو انوار احمد کا نام اردو افسانہ کے ناقد کے طور پر لیا جاتا ہے۔ خود ڈاکٹر صاحب نے اپنے کالم "وعدہ خلافی" میں اپنی اس کاوش کو اردو افسانے کی تنقیدی تاریخ سے موسوم کیا ہے۔ (۸) 'افسانہ۔ ایک صدی کا قصہ' دراصل ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے اس لیے بنیادی طور پر تو یہ تحقیق ہی ہے مگر اس میں تجزیہ کا حصہ بھی بہت مضبوط ہے۔ ڈاکٹر نجیب جمال صاحب اور ڈاکٹر خاور نوازش نے اس تصنیف کو تحقیق کے خانے میں رکھا ہے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن "اردو افسانہ۔ تحقیق و تنقید" کے نام سے شائع ہوا۔ کتاب کی قرأت کے بعد میری نظر میں اس کتاب کا موضوع تحقیق و تنقید ہے۔ تحقیق و تنقید دونوں ادب کے شعبے ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کے ساتھ گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ دونوں کو الگ الگ خانوں میں نہیں رکھا جا سکتا کیونکہ ادب میں جہاں تحقیق ہو گی وہاں تنقید جلوہ گر ہو گی۔ دونوں شعبوں میں حقائق کی جانچ پرکھ کی جاتی ہے۔ ایک مخلص محقق تنقیدی بصیرت کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ڈاکٹر گیان چند اپنی کتاب "تحقیق کا فن" میں جارج وھیلے کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ایک سچے محقق کو اپنے کام میں تنقیدی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ محقق ایک عبارت اراء بن کر رہ جائے گا جب تک تحقیقی علم نہ ہو تنقید محض ایک تصور خیال کی جاتی ہے۔ (۹)

ڈاکٹر صاحب تحقیق کے تقاضوں کو سمجھتے ہیں اس لیے وہ اپنی کتاب میں رقمطراز ہیں کہ اُن کا خیال تھا کہ کہانی کار کے فن پر تبصرہ کے ہمراہ سوانحی معلومات بھی فراہم کی جائیں اور ان کے افسانوں کی تخلیق شدہ کہانیوں کے نام بھی شامل کیے جائیں اور یہ امر مصنف کے بقول ان کے لیے بہت مشکل ثابت ہوا تھا کیونکہ اس مقصد کے لیے انھیں بہت سی کتب کا مطالعہ کرنا ضروری تھا لیکن اس کے باوجود انوار صاحب خود کو اس مشکل مرحلے سے گزارتے ہیں۔

"یہ آخری بات کافی مشکل ثابت ہوئی۔ کیونکہ بہت سی کتابیں پڑھے بغیر ہم لوگ تبصرہ کرنے میں قادر ہیں۔ مگر اس طرح کی قیاسی تفصیلات گھڑنے کی ہمت نہ ہو سکی۔" (۱۰)

ڈاکٹر صاحب اردو کے اوّلین افسانے کے تعین میں کافی چھان پھٹک کرتے ہیں اور اس خیال کی نفی کرتے ہیں کہ سجاد حیدر یلدرم کا افسانہ "نشے کی پہلی ترنگ" اردو کا پہلا افسانہ ہے وہ سجاد حیدر یلدرم کے اُس نوٹ کا حوالہ دیتے ہیں کہ انھوں نے یہ افسانہ ترکی زبان کے رسالے ثروت فنون سے ترجمہ کیا ہے ۔(۱۱) وہ تحقیق سے اس بات کی تہہ میں جاتے ہیں کہ کہانی "نصیر اور خدیجہ" اردو کا پہلا افسانہ ہے۔ اپنی اس تحقیق کے حوالے سے وہ یہ انکشاف کرتے ہیں کہ یہ افسانہ پہلی بار مخزن میں ۱۹۰۳ء میں شائع ہوا، مزید یہ افسانہ مخزن کی جلد نمبر ۶ اور شمارہ نمبر ۳ اور صفحات ۲۷ تا ۳۱ میں اپنا ظہور پاتا ہے۔ (۱۲) ڈاکٹر صاحب کا مزاج تحقیق سے دلچسپی اور حق گوئی کا ہے وہ تاریخ کا شعور رکھتے ہیں اور اردو افسانے کے ماضی سے آگہی رکھتے ہیں۔ اپنی اس آگہی کو فسادات کے موضوع پر لکھے جانے والے افسانوں کا طائرانہ جائزہ لے کر عیاں کرتے ہیں کہ فسادات پر ہر طرح کے افسانے لکھے گئے جن سے قاری سماج کی چیرہ دستیوں اور تاریخ کے نشیب و فراز سے آگہی حاصل کرتا ہے۔ وہ افسانہ نگار اشفاق احمد کے دو افسانوں "گڈریا" اور "بابا" کو اس حوالے سے بہت اہم خیال کرتے ہیں۔ (۱۳)

ڈاکٹر صاحب کم سے کم الفاظ میں قاری پر مافی الضمیر ظاہر کر دیتے ہیں۔ الطاف فاطمہ کے فن افسانہ نگاری کے متعلق لکھتے ہیں کہ اُن کی کہانیوں میں ایک احساس تنہائی، ملال اور صنعتی معاشرت کا خوف ملتا ہے۔ (۱۴) جو گندر پال کے بارے لگتے ہیں:

Vol.5 No.1 2022

ISSN Online: 2709-7625

ISSN Print: 2709-7617

"جوگندر پال کے ہاں موت ایک آسیب کی طرح ہے، کہیں نعشوں کا پوسٹ مارٹم ہو رہا ہے تو
کہیں کوئی مردہ گم ہو گیا ہے۔ یا کسی زندہ کو مردوں میں شمار کیا جا رہا ہے۔" (۱۵)

ڈاکٹر صاحب اپنی تحقیق کے دوران افسانہ نگاروں کے فن افسانہ سے متعلق نقطہ نظر کو محض اپنی رائے کی تائید کے لیے استعمال نہیں کرتے۔ بلکہ فن افسانہ کی وسعت کو آشکار کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اس عمل میں وہ یہ ضرور تحقیق کرتے ہیں کہ افسانہ نگارنے جو بات اپنی افسان ہنگاری سے متعلق کہی کیا وہ اس کے فن پر پوری بھی اترتی ہے یا نہیں۔ اس سلسلے میں وہ فرخندہ لودھی، زاہدہ حنا، احمد ندیم قاسمی، عابد علی عابد، محمد منشایاد کے افسانہ نگاری کے نقطہ نظر کو اپنی تصنیف میں نقل کرتے ہیں، جیسا کہ وہ محمد منشایاد کے فن افسانہنگاری کو نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کسی انوکھے خیال یا معمول اور معقولیت سے ہٹی ہوئی کسی بات کی پونی میرے ہاتھ آتی ہے تو
ذہن ف ورا ہ ی ک س ی ن ئ ی ک ہ ان ی ک ا س وت ک ات ن ے ل گ ت ا ہ ے، ہ ر ک ہ ان ی ک ا ر ک ی ط رح م ی رے ان در ب ھ ی ای ک
بیٹھی ہے جو دن رات مختلف خیالوں کے رنگا رنگ گنجھل کھلتی، اُنہیں ایک دوسرے سے الگ کرتی
اور گولے پنے بناتی رہتی ہے۔" (۱۶)

افسانے کے فن کے حوالے سے مندرجہ بالا کہانی کارنے جو اپنا نقطہ نظر آشکار کیا ہے اس کے اسلوب سے واضح ہے کہ وہ دیہات سے اپنے افسانے کے لیے مواد حاصل کرتے ہیں اور انوار احمد صاحب بھی اس اقتباس کو نقل کرنے کے بعد محمد منشایاد کی افسانہ نگاری کے خیال کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اُنکی افسانہ نگاری کی انفرادیت معصوم دہقانیت، پنجاب کے لوک گیتوں اور افسانے کی روایت سے قوت حاصل کرتی ہے۔ وہ کسی فن اور فنکار پر بات کرتے ہوئے اُس کی تاریخ اور نفسیاتی محرک کو پیش نظر رکھ کر محقق کے فرائض بھی انجام دیتے ہیں۔ منٹو کے فکر و فن کی تفہیم میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

"جلیانوالہ باغ کا سانحہ (۱۹۱۹ء) جب رونما ہوا تو منٹو سات برس کا بچہ تھا مگر اس سانحہ کی اثر
آفرینی دیکھیے کہ منٹو کا پہلا افسانہ 'تماشا' ہی اس حادثے کے بارے میں ہے، یہ امر انتہائی معنی
خیز ہے کہ منٹو نے اس افسانے کے مرکزی واقعے کو بچہ کی نظر سے دکھایا ہے۔" (۱۷)

تاہم ان کی تاریخی تحقیق محض حقائق کی ہی اسیر بن کر نہیں رہ جاتی بلکہ وہ ادب کے جمال کے عرفان میں بھی اہم ذریعہ بنتی ہے۔ راشد الخیری کے فن پر یوں گویا ہوئے:

"مولانا ایسی زبان میں بات کرنا بہت پسند کرتے ہیں، گود میں لڑکی، خیال میں شاہیں، لب پر دعا،
اور دل میں آہیں، مگر نذیر احمد کی طرح راشد الخیری کہانی بننے کی حیرت انگیز صلاحیت رکھتے
ہیں۔" (۱۸)

بعض اوقات ڈاکٹر صاحب اپنی تحقیق کی بنیاد بیانیہ تقابلی جائزے پر بھی رکھتے ہیں۔ جیسا کہ ڈاکٹر صاحب بلونت سنگھ کے فن کا تقابلی جائزہ احمد ندیم قاسمی کے فن سے کرتے ہیں۔ قراۃ العین اور اشفاق صاحب کی کردار نگاری پر بھی تحقیق میں یہی صورت ملتی ہے:

"قراۃ العین حیدر کے معمر کردار بالعموم مہاتما بودھ کی طرح خاموش رہتے ہیں اور اُن کی چپ
ماحول کو گمبھیر ہی نہیں سوگوار بھی بناتی ہے، جب کہ اشفاق احمد کے تنہا، اداس اور دل گرفتہ
کردار بولتے ہیں اور اُن کے مکالمے بھی دلوں پر وار کرتے ہیں۔" (۱۹)

Vol.5 No.1 2022
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

اُن کا مذکورہ کتاب میں تحقیقی وتنقیدی کام نہایت دقیع ہونے کے ساتھ ساتھ کئی اوصاف کا حامل نظر آتا ہے۔وہ محقق پہلے ہیں اور نقاد بعد میں ہیں علی عباس حسینی کے متعلق کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ وہ ترقی پسند ہیں اور کچھ لوگ ان کو اس تحریک سے خارج سمجھتے ہیں۔انوار احمد صاحب نے اس بات کی تحقیق ان الفاظ کے اظہار سے کی:

> "علی عباس حسینی کے ایک افسانے 'بھکاری' (میلہ گھومنی) کا طنزیہ اسلوب ہندوستان کے بیشتر انقلابیوں کے تضادات کو نمایاں کرتا ہے۔جس سے اس تاثر کو تقویت ملتی ہے کہ وہ انجمن ترقیپسند مصنفین کے پُرجوش مقلد نہیں ہیں۔" **(۲۰)**

اردو شعر وادب میں قدیم اور جدید ادوار میں تحقیق وتنقید کا انجذاب ملتا ہے۔قدیم دور میں آزاد کی آب حیات، حالی کی یادگار غالب، وحیات سعدی اور شبلی نعمانی کی شعر العجم اس کی اہم مثالیں ہیں۔جدید دور میں تحقیق وتنقید کا انجذاب ہمیں شمس الرحمان فاروقی، گوپی چند نارنگ، وارث علوی، مرزا حامد بیگ اور دوسرے محققین اور ناقدین کی تصانیف میں ملتا ہے۔اپنی اس تصنیف میں ڈاکٹر صاحب نے جتنے بھی کہانی کاروں کے فن پر تحقیق کی ہے وہ سرسری دکھائی نہیں دیتی۔بلکہ ایک دستاویزی حیثیت کی حامل ہے۔بر اوَن بک پبلی کیشنز نئی دلی، کے ڈائریکٹر سجاد اختر ڈاکٹر صاحب کے مطالعاتی حوالوں کو انسائیکلوپیڈیا کا درجہ دیتے ہیں۔ **(۲۱)** ان کی تحقیق میں قاری حقائق کی بازیافت کو پانے کے ساتھ ساتھ یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنا مخصوص نقطہ نظر بھیر کھتے ہیں۔ڈاکٹر صاب انگارے میں شامل افسانوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> "انگارے میں دو بھی ایسے افسانوں کا انتخاب کیا جائے جو فنی اعتبار سے کامیاب اور فکری وجذباتی اعتبار سے ہنگامی اثرات کی بجائے دیرپا اثرات کے حامل ہیں تو، 'دلاری' ان میں سے ایک افسانہ ہوگا۔یہ کرداری افسانہ ہے اور سجاد ظہیر کی اس افسانوی وتخلیقی صلاحیت کا مظہر ہے جو توڑ پھوڑ اور تخریب کے ابال اور اشتعال سے بے نیاز رہ کر بھیروبہ عمل ہو سکتی تھی۔" **(۲۲)**

ڈاکٹر صاحب اپنی تصنیف میں افسانہ نگاروں کے فن کی ترسیل مکمل صحت کے ساتھ بیان کرنے پر کاربند ہیں۔ان کا یہ عمل انھیں تنقید کا حریف نہیں بلکہ معاون رفیق ثابت کرتا ہے۔وہ منٹو کے فن پر ناقدین کو آڑے ہاتھوں لیتے ہیں۔جب حسن عسکری نے 'سیاہ حاشیے' کی کہانیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ اعتراض اٹھایا کہ منٹو نے نہ ظالموں پر لعنت بھیجی ہے نہ مظلوموں پر آنسو بہائے ہیں اور انھوں نے یہ تفیصلہ نہیں کیا کہ ظالم لوگ برے ہیں یا مظلوم اچھے ہیں تو اس پر ڈاکٹر صاحب حسن عسکری کے اعتراض کو منطقی طریق سے رد کرتے ہیں:

> "میرے خیال میں یہ درست نہیں۔اُس نے قاتلوں کے سامنے آئینہ رکھ دیا ہے۔جس میں اُن کی بربریت اور انسانیفطرت کی کشاکش کی پیچیدہ تصویر واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔منٹو کسی بھی موقع پر انسان دوستی کا رویہ ترک نہیں کرتا یہاور بات ہے کہ یہاں اُس کے زہر خند کی
> رم زی ت م ی ں ظ ال م، م ظ ل وم اور ظ ل م م ل ف وف ہ ی ں وہ ع م وم اَ دوس رے م ع اص ری ن ک ی ط رح ک ھ ل ے اور ن ن گ ے
> اشارے نہیں کرتا۔" **(۲۳)**

انداز بیاں لکھنے والے کی شخصیت کا عکس ہوتا ہے۔اس کی شخصیت میں موجود جذبات، احساسات، محرکات تک رسائی اسلوب کی مرہون منت ہے۔اسلوب سے مصنف کے مزاج کی خبر ملتی ہے اور تحریر میں مصنف کے مقصد کو پہچانا جاتا ہے۔اس کے اسلوب نگارش سے عیاں ہوتا ہے کہ وہ اپنے موضوع پہ کتنا عبور رکھتا ہے۔اس کے تحریر سے یہ علم بھی ہوتا ہے کہ وہ کسی روایت کو اپناتا ہے یا اس سے انحراف رکھتا ہے۔ایک مصنف جب اپنے خیالات کو پیش کرتا ہے تو اس کے پیچھے اس کا تجربہ ومشاہدہ کارفرما ہوتا ہے۔بغیر تجربے ومشاہدے کے وہ کسی نظریہ اور خیال کو بیان کرنے کی تخلیقی توانائی نہیں رکھتا۔جیسا کہ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے کہا تھا:

Vol.5 No.1 2022
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

"نثر لکھنے یا بولنے والا جس جگہ آنکھ کھولتا ہے جس ماحول میں اس کی نشو نما ہوتی ہے، جو تہذیبی
اور معاشرتی اثرات اسے ورثے میں ملتے ہیں، جن حالات میں اُس کی تعلیم و تربیت ہوتی ہے، جن
لوگوں سے وہ متاثر ہوتا ہے، اس کیجو دلچسپیاں ہوتی ہیں، جو رجحانات اس کے ہاں پیدا ہوتے ہیں
جن مصنفوں کو وہ مطالعہ کرتا ہے جو خیالات و نظریات اس کے ہاں تشکیل پاتے ہیں ان سب کے
مجموعی اثرات سے اس کا مخصوص انداز آہنگ اور لب و لہجہ وجود اختیار کرتا ہے اور اس سے اس
کی نثر پہچانی جاتی ہے جس کو وہ بولنے یا لکھنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔" **(۲۴)**

ڈاکٹر صاحب اپنے اسلوب سے ترقی پسند نقاد ہیں۔ ترقی پسند ادب و تنقید کے اہم لوازمات میں حسن و صداقت کی اقدار کیتلاش، انسان دوستی، معاشرتی مسائل کا بیان اور اس بنا پر ادب پاروں کا تجزیہ، تاریخی شعور، غلامی، ظلم، ناانصافی کے خلاف بغاوت شامل ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحبکی تنقید میں عمرانی اور سماجی حقیقت پسندی کے یہ اثرات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ انوار احمد صاحب فکشن کی تنقید کو مختلف خانوں میں بانٹنے کے قائل نہیں۔ (اگر انھوں نے یہ عمل اپنی تصنیف کے تیسرے ایڈیشن میں کیا ہے تو طلبا کی تفہیم کی آسانی کے لیے کیا ہے۔) و ہ اردو افسانے کے آغاز میں سیاسی غلامی اور معاشرتی پسماندگی کی موجودگی کو بہت اہمیت دیتے ہیں کہ اس سیاسی غلامی اور معاشرتی پسماندگی نے ہندوستانی معاشرے کو ادب کے میدان میں دو حصوں میں بانٹ دیا تھا۔ ایک حصے نے خود کو رومانی سوچ تک محدود رکھا، داخلی رجحانات اپنا کر ذہنی و جذباتی آسودگی کے حصول کی کوشش کی اور دوسرے حصے نے استحصالی نظام سے نفرت کے علاوہ غربت اور جہالت کو اپنی تقدیر ماننے سے انکار کیا۔ انوار احمد صاحب کے نزدیک دو مختلف رجحانات کے پیچھے ایک ہی سبب یعنی سماجی محرک کار فرما ہے۔ ڈاکٹر صاحبانسانی ذات اور اس کے داخلی رجحانات کو خارجی دنیا کا عکس خیال کرتے ہیں۔ **(۲۵)**

ترقی پسند تنقید نے اردو ادب کے دامن کو وسعت دی ہے۔ ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے اپنے مضمون 'جدید تر کہانی۔ ترقی پسندی سے انحراف یا اعتراف' میں بیان کرتے ہیں:

"پورے افسانوی سفر کو ذہن میں رکھا جائے اور اس کے تدریجی ارتقا پر نظر ڈالی جائے تو یہ
حقیقت واضح ہوتیہے کہ اردو میں ترقی پسندی کا دور شاعری یا کسی صنف ادب کے لیے خواہ کیسا
بھی رہا ہو، مگر افسانے کے تعلق سے اس تحریکا زمانہ عہد زریں اور شاندار ادب کہا جائے گا۔ اور
یہ بات اس تحریک کے کٹر مخالفوں نے بھی تسلیم کی ہے۔" **(۲۶)**

کچھ ناقدین خیال کرتے ہیں کہ ترقی پسند تحریک نے رومانوی تحریک سے صرف دو چیزیں حاصل کی ہیں ایک بیانیہ جس سے افسانے میں موجود مرکزی خیال کے ابلاغ کی ترسیل قاری تک ممکن ہو سکی اور دوسری چیز افسانے میں موجود کہانی کے وجود کو گم نہیں ہونے دیا در اصل انوار احمد صاحب نے اپنی اس تصنیف کی ابتدا ہی سے اپنی سوچ اور نقطہ نظر کی سمت متعین کر لی ہے۔ پریم چند کے نام سے قبل وہ تین افسانہ نگاروں کا نام لیتے ہیں۔ یعنی راشد الخیری، سجاد حیدر یلدرم اور سلطان حیدر جوش لیکن وہ ترقی پسندی کے جراثیم راشد الخیری کی افسانہ نگاری ہی میں پہچان لیتے ہیں۔ جیسا کہ وہ لکھتے ہیں:

"آزار پ س ن د رس وم و رواج، م ع اش رت ی ت ض ادات اور خ ص وص اَ م ل ائ ی ت پ ر م ول ان ا ج س ط رح ب رس ے ہ ی ں اور
جیساز ہر خند ایسے موضوعات پر طبع ازمائی کرتے ہوئے ان کے لبوں پر کھیلا ہے وہ ترقی پسند
تحریک کے اوّلین دور کی تخلیقات سے مماثل ہے۔" **(۲۷)**

ڈاکٹر صاحب نے رومانوی افسانہ نگار سجاد حیدر یلدرم کو بھی سر خیل قرار دیا ہے کہ وہ 'حریت پسند' (نو آبادیاتی طاقت کے خلاف بر سر پیکار) ترک قوم سے اپنے رشتے کو برملا تسلیم کرتا ہے۔ وہ اردو افسانہ کی روایت کا آغاز اگرچہ پریم چند کی مثالیت سے واقعیت نگاری سے کرتے ہیں۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ ترقی پسند مصنفین کے پہلے اجلاس کی صدارت پریم چند نے ۱۹۳۶ء میں کی۔ خود ڈاکٹر صاحب نے پریم چند کے افسانوں میں حسن و صداقت کی اقدار کی تلاش، انسان دوستی، تاریخی شعور، ظلم ناانصافی کے خلاف بغاوت، معاشرتی مسائل کی عکاسی کرنے والے افسانوں کی نشان دہی کی ہے اور ایک جگہ تو پریم چند کے

Vol.5 No.1 2022
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

کہانی"شکوہ وشکایت "کے حوالے سے ممتاز شریں کی اس افسانے پر ستائش کو تشکیک بھری نگاہوں سے دیکھتے ہیں وہ اس مقام پر اپنے اس خدشے کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ ممتاز شریں اس افسانے کی تعریف اس لیے کرنا چاہتی ہیں کہ دیگر ' خطرناک ' افسانوں کی اہمیت کو کم کیا جائے۔ (۲۸) یہاں انوار احمد 'خطرناک 'کا لفظ اپنے نظریاتی حوالے سے لیتے ہیں۔انوار احمد صاحب کی محققانہ نگاہ محض اس بنا پر پریم چند کو ترقی پسندی سے الگ کرتی ہے کہ وقت کے گزرنے کے ساتھ ان کے آدرش اور فنی تقاضوں میں آویزش نہ رہی یا کم از کم نمایاں نہ رہی۔اردو افسانہ لکھنے والوں میں خواہ وہ ترقی پسند ہوں یا وہ رومانوی مزاج کے حامل ہوں مصنف ان افسانہ نگاروں کے افسانوں کا مطالعہ کرتے ہوئے معاشرتی تناظر اور تہذیب وثقافت کو پس منظر میں دیکھنے کے عادی ہیں۔یہ تناظر عمومی طور پر ترقی پسند والا ہوتا ہے۔ترقی پسند ادب وتنقید میں کوئی ذہنی کیفیت مکمل طور پر نہ داخلی ہوتی ہے اور نہ ہی خارجی بلکہ ایک ہی وقت میں دونوں موجود ہوتی ہیں۔ترقی پسند ادیب و نقاد نہ تو داخلی طور پر تجزیہ کرکے خود کو محدود کرتا ہے نہ ہی خارجیت میں خود کو گم کرکے اپنی ذات سے انکار کرتا ہے۔ترقی پسند نقاد کے نزدیک داخلی کیفیات اور ان کے خارجی محرکات ادب کے ضروری عناصر ہیں۔جیسا کہ رشید امجد کی کتاب"پاکستانی ادب تنقید میں ظہیر کاشمیری اپنے مضمون (مارکسی تنقید) میں لکھتے ہیں:

"انسانی ذہن کا ہر مواد جہاں سماجی محرکات سے ترتیب پاتا ہے وہاں اس کی ذاتی قوتوں کا عنصر
بھی شامل ہوتا ہے۔ اس لیے کوئی ذہنی کیفیت بھی کلیتاً داخلی ہوتی ہے نہ ہی خارجی بلک
خارجی اور داخلی عنصر بیک وقت موجود ہوتے ہیں۔یہی وہ تھیوری ہے جس پر مارکسی ادب وتنقید
کی بنیاد ہے۔"(۲۹)

انوار احمد صاحب اس حقیت کو افسانے کی تاریخ(اردو قصے کی کہانی) کے حوالے سے کچھ اس طرح سے رقمطراز ہوتے ہیں:

"اگر فیشن یا شعبدہ بازی کی خاطر علامت سے کام لینے والوں سے صرفِ نظر کر لیا جائے تو
احساس ہو گا کہ اس کے بدولت اردو افسانے کی کائنات میں رمزیت اور تہہ داری پیدا ہوئی اور
یوں سیاسی حقیقت اور نفسیاتی حقیقت کے مابین موجود فاصلے بھلے بڑھے، مگر افسانے کی کائنات
میں یکجا ہو گئے۔"(۳۰)

ان سطور سے ہم قیاس کرسکتے ہیں ہے کہ ڈاکٹر صاحب اپنی سوچ نقطہ نظر میں بالکل واضح ہیں اور وہ ترقی پسندی کو آج کے دور میں لکھی جانے والی جدید کہانی کا پیش رو قرار دیتے ہیں۔

انوار احمد صاحب نے پریم چند کے ذکر کے بعد منٹو جیسے بڑے افسانہ نگار کو بھی ترقی پسند افسانہ نگاروں سے الگ کیا ہے۔حالانکہ وہ پریم چند اور منٹو کے فن کو ترقی پسندی کے حوالے سے جانچتے اور پرکھتے ہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

"سہائے کے آغاز پر خلافِ معمول منٹو کی ایک جذباتی تقریر ہے مگر اس سے منٹو کے نقطہ نگاہ کو
سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے،' یہ مت کہو کہ ایک لاکھ ہندو اور ایک لاکھ مسلمان مرے ہیں یہ کہو
کہ دو لاکھ انسان مرے ہیں۔"(۳۱)

ان سطور سے ڈاکٹر صاحب نے منٹو کی انسان دوستی کو اجاگر کیا ہے۔وہ منٹو کو انسان دوست سمجھتے ہیں اور عزیز احمد کے اس اعتراض کی نفی کرتے ہیں کہ منٹو میں انسان دوستی کا فقدان بلکہ غیاب ہے۔ڈاکٹر صاحب ترقی پسند نقاد ہیں لیکن ان کی ترقی پسندی رجعت پسند نہیں۔منٹو اپنے جن افسانوں کی وجہ سے ترقی پسند ناقدین کا حرف تنقید بنتے ہیں ڈاکٹر صاحب خود کو ایسے ترقی پسندوں سے الگ رکھتے ہیں اور ایک بہترین محقق کی طرح حسن عسکری، ممتاز شریں اور وارث علوی کی اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ منٹو کے بدنام زمانہ افسانوں میں زندگی اور انسانی فطرت کی تہیں کھلتی ہیں۔اسی طرح وہ ان ترقی پسندوں کی بھی سرزنش کرتے ہیں جنھوں نے منٹو کو اپنے رجسٹروں سے خارج کیا تھا۔انوار احمد صاحب کی تحریریں انتقادی و نظریاتی دونوں رجحان یکساں نظر

Vol.5 No.1 2022

ISSN Online: 2709-7625

ISSN Print: 2709-7617

آتے ہیں۔وہ افسانے کے مطالعہ میں تنقیدی انداز اختیار کرتے ہیں اور افسانوں میں کرداروں وماحول کو زمینی حقائق سے منطبق کرتے ہیں۔منٹو کے افسانے پر جب عابد علی عابد اعتراض کرتے ہیں کہ طوائف کے لیے ہتک معمول کی بات ہے،اس لیے سوگندھی کا غیر معمولی ردعمل کیوں؟تو انوار احمد صاحب اس اعتراض کے جواب میں کہتے ہیں:

"ماجرا یہ ہے کہ ناول نگار کے مقابلے میں افسانہ نگار کی زندگی کے کسی معنی خیز لمحے کا انتخاب کرتا ہے،یاد منظر یا واقعے کے سلسلے کی ایک کڑی پر توجہ مرکوز کرتا ہے،اس لیے 'ہتک' میں تماشبین کے منہ سے نکلا ہوا ایک لفظ 'اونہہ' سوگندھی کی زندگی کا وہ لمحہ بن جاتا ہے،جب اس کا غیظ و غضب مردانہ سماج کے واجب الادا قرضے کی سود سمیت ادائیگی بن کے خراج پاتا ہے۔"(۳۲)

'اردو افسانہ۔ایک صدی کا قصہ' میں ڈاکٹر صاحب اشتراکی فلسفے کو پسند کرتے ہیں اس حوالے سے ان کا مضبوط موقف ہے اور اس موقف کا وہ بھرپور دفاع بھی کرتے ہیں۔اپنی کتاب میں وہ وارث علوی،ممتاز شریں اور حسن عسکری کے کرشن چندر کے فن پر اس اعتراض کا بھرپور جواب دیتے ہیں کہ کرشن چندر کے ہاں آدمی کو سمجھنے کی اتنی کوشش نہیں کی جاتی جتنی آدمی کو سمجھے بغیر اسے اور نظام کو بدلنے کی کی جاتی ہے۔ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

"اب اگر تو آدمی کو سمجھنے کا واحد راستہ تحلیل نفسی کے طریق میں سے لجلجے اندھیرے اور لذت کی مدد سے من چاہے معانی اخذ کرنے کا ہے تو کرشن چندر آدمی کو نہیں جانتا تھا،اور اگر آدمی اپنی فطرت کے ساتھ ساتھ،اپنے گردوپیش (سماج،تاریخ،ثقافت) سے بنیادی رنگ اور وضع اختیار کرنے والی عمرانی حقیقت کا نام ہے،تو وہ بہت سے وجودیوں کے مقابلے پر آدمی سے زیادہ باخبر اور واقف تھا۔"(۳۳)

اس اقتباس سے ڈاکٹر صاحب کی ترقی پسند تنقید سے رغبت کھل کے سامنے آتی ہے۔ایسا نہیں ہے کہ وہ انسان کی ذات کے نہاں خانے کو اہمیت نہیں دیتے لیکن جب ان کی فکر و فلسفے سے ہٹ کر کوئی کسی فن پارے کو ایک رخ سے دیکھتا ہے تو وہ اپنے موقف کی حمایت میں طنزیہ انداز اختیار کر لیتے ہیں۔ایک ترقی پسند ناقد نہ تو اپنے آپ کو ادب کے داخلی اور وجدانی تجزیوں تک محدود رکھتا ہے اور نہ ہی وہ ادب میں صرف خارجیت کو تلاش کر کے ادیب کی ذات کی نفی کرتا ہے۔اس لیے اوپر بیان شدہ اقتباس میں انھوں نے مذکورہ ناقدین کو وجودی کہہ کر طنز کیا ہے۔اسی طرح ڈاکٹر صاحب دیوندا سر کے فن کی تعریف ان الفاظ میں کر کے اپنے مخصوص نقطہ نظر کو اجاگر کرتے ہیں:

"دی ون در اس رک ا ای ک ن سُ مبرانام شکست ہنہ ہ 'ایف سی ایشیاہ' نظر ہے،جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسر کو عصری تبدیلیوں کا پورا احساس ہے،مگر جدت طرازی کی آرزو میں اس نے جو گندر پال بننا پسند نہیں کیا۔"(۳۴)

ان سطور میں ڈاکٹر صاحب کا اسر کے فن کا جوگندر کے فن سے تقابلی جائزہ ان کی غیر مفاہمہ ء قلبی کو ظاہر کرتا ہے۔وہ جوگندر کے فن کو یہ کہہ کر نظر سے گرا دیتے ہیں کہ جوگندر واقعات کو اہم نہیں سمجھتے بلکہ تاثرات کو فوقیت دیتے ہیں۔ڈاکٹر وزیر آغا کے ذکر کے ساتھ جب وہ اس بات کا ذکر کرتے ہیں کہ انہوں(جوگندر) نے سیاسی و سماجی شعور کی حامل تحریروں سے خود کو الگ کرنے کی کوشش کی ہے تو اس تناظر میں مصنف کا لب ولہجہ ایک طرح سے بغاوت کا عنصر رکھتا ہے۔کچھ ایسے ہی جذبات کا اظہار سریندر پرکاش کے فن کا تجزیہ کرنے کے دوران شمس الرحمٰن فاروقی کی اس بات کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔کسی ایک افسانے کو دوسروں سے الگ کر کے دیکھنے کا طریقہ نئے افسانے کی تنقید کے لیے مناسب نہیں۔فاروقی صاحب کا اشارہ سریندر پرکاش کے افسانے بجوکا اور بازگوئی کی طرف تھا۔اس پر ڈاکٹر انوار احمد رقمطراز ہوتے ہیں:

"فاروقی صاحب کو زیادہ تشویش اس بات کی ہے کہ ان کے رسالے 'شب خون' میں شائع ہونے والے تخلیق کاروں کی تحریروں سے سیاسی اور سماجی شعور کی کسی جھلک تک محسوس نہ ہو،نہ

Vol.5 No.1 2022
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

ہی سماجی تبدیلی کے آرزومندوں کو ایسے کسی تخلیق کار کے ذہنی اور جذباتی تجربے میں شرکت
کی ترغیب ملے"(۳۵)

ڈاکٹر صاحب کی یہ تنقید افسانے کی اصل معنویت کو ظاہر کرتی ہے۔ جہاں جدید دور کے افسانے کے ناقد سریندر پرکاش کے افسانہ بجوکا کو مابعد جدید رویے کی عکاسی خیال کرتے ہیں وہاں ڈاکٹر صاحب کی افسانے کی تفہیم افسانے کو سیاسی اور سماجی شعور سے الگ نہیں ہونے دیتی۔

ترقی پسند تحریک کے بعد ایک ایسا دور بھی اردو افسانے نے دیکھا جب نئے نئے تجربات کے شوق میں ابلاغ کے مسئلے نے جنم لیا۔ یہ دور ۱۹۶۰ء سے ۱۹۸۰ء تک کا ہے۔ اس دور میں تجریدی اور علامتی افسانے تحریر کیے گئے اور ترقی پسند تحریک سے انحراف کرنے کے چکر میں جدیدیت کے نام پہ افسانے میں کہانی پن اور بیانیہ کی خوبی سے منھ موڑا گیا۔ جدیدیت کی حمایت میں سب سے بڑا نام گوپی چند نارنگ اور شمس الرحمان فاروقی کا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے افسانے سے زیادہ شاعری کو اہمیت دی ان کے خیال میں نظم پہلے وجود میں آئی اور افسانہ بعد میں لہٰذا حقیقی جذبات کی ترجمانی نظم کی صورت میں ممکن ہے اگر افسانے میں بیانیہ صورت اختیار کی گئی تو افسانہ محض حقیقت کی نقل بن کے رہ جائے گا۔ اسی رویہ نے اردو افسانے میں ابلاغ کے مسئلے کو ظہور دیا اور قاری سے اپنے رشتے کو کمزور کیا۔ شمس الرحمان فاروقی نے اپنے مضمون افسانے کی حمایت میں کہا:

"اصل الاصول تو یہ ہے کہ افسانہ اتنی گہرائی اور باریکی کا متحمل ہی نہیں ہو سکتا جو شاعری کا
وصف ہے۔۔۔ ہمارے یہاں افسانے اور ناول کا وجود اتنا پر قوت اور نمایاں نہیں ہے جتنا
شاعری کا ہے افسانے میں انقلابیاں تبدیلی ممکن نہیں ہیں بس ایک انقلابی تبدیلی آپ نے کر
لی کہ پلاٹ غائب کر دیا، Time sequience کو Upset کر دیا اس سے آگے گاڑی رک
جاتی ہے، بڑی صنف سخن وہ ہے جو ہمہ وقت تبدیلیوں کی متحمل ہو سکے۔ افسانے کی چھوٹائی یہی
ہے اس میں اتنی جگہ نہیں ہے کہ نئے تجربات ہو سکیں۔"(۳۶)

گوپی چند نارنگ تو طویل عرصے تک علامتی اور تجریدی افسانہ نگاری کے حق میں مضامین لکھتے رہے اور ۱۹۸۰ء میں جدیدیت کے نام پر اردو فکشن پر ہندو پاک سیمنار کا اہتمام بھی کیا جس کے احوال کا تذکرہ ارتضیٰ کریم اپنے ایک مضمون 'جدید تر کہانی۔ ترقی پسندی سے انحراف یا اعتراف' میں کرتے ہیں۔ (۳۷) تاہم نارنگ صاحب اپنے مضمون 'نیا افسانہ۔ روایت سے انحراف اور مقلدین کے لیے لمحہ فکریہ' میں اعتراف کرتے ہیں کہ جدیدیت کے اس رجحان نے اردو افسانے کو نقصان پہنچایا۔ وہ تسلیم کرتے ہیں:

"ایسی ناپختہ تحریروں کو نہ کہانی کہا جا سکتا ہے نہ انشائیہ۔ اگرچہ ایسے افسانوں میں جو کوشش ملتی
ہے وہ انشائیہ پردازی کی ذیل میں آتی ہے۔ دراصل تقلید کے جوش میں یاروں نے بستیاں بہت
دور بسالی ہیں اور کہانی کے بنیادی تقاضوں کو فراموش کر دیا ہے یا پیرائیہ اظہار، یا وسیلہ بیان کو ہی
مقصود بالذات ہی سمجھ لیا گیا ہے۔"(۳۸)

ظاہر ہے جدید ذہن رکھنے والوں کی یہ سوچ مثبت نہیں تھی بلکہ محض ترقی پسند تحریک کے خلاف محاذ تھا اور اس سوچ سے اردو افسانے کی تدریجی ترقی میں رخنہ پڑا۔ اس صورت حال میں جدیدیت پر لکھنے والے افسانہ نگاروں نے نئی صورت حال کو بھانپا اور افسانے کی حقیقی روایت کی طرف رجوع کیا جس میں حد سے زیادہ تخلیقی توانائی تھی۔ اس نقصان کی وجہ سے گوپی چند نارنگ اور ان کے پیروکاروں کو اپنا محاسبہ کرنا پڑا۔ چنانچہ انوار احمد صاحب بھی اردو افسانے کی تاریخ میں جدیدیت کے رجحان کی ملامت کر کے قاری سے اس تحریک کا تعارف کراتے ہیں۔ وہ نہ تو اس رجحان کے ارتقاء کو بیان کرنے میں کوئی دلچسپی رکھتے ہیں اور نہ ہی اس تحریک کے اہم افسانہ نگاروں کے ان افسانوں کو لائق توجہ خیال کرتے ہیں جو انشاپردازی کی ذیل میں آتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ رقمطراز ہیں:

Vol.5 No.1 2022

ISSN Online: 2709-7625

ISSN Print: 2709-7617

"اسی دور میں افسانے کے نام پر عامیانہ ڈائجسٹوں نے لذیت، سطحیت اور نام نہاد ماورائیت سے بھرپور کہانیوں کا بازار گرم کر دیا۔ اس صورت حال کی ذمہ داری خود افسانہ نگار پر یوں عائد ہوتی ہے کہ اس نے دانشوری کے زعم میں کہانی کے عنصر کو افسانے سے خارج کر کے اسے علوم کا کیپسول یا تحلیل نفسی کا چارٹ بنا ڈالا تھا۔ مگر یہ امر خوش آئند ہے کہ گزشتہ برسوں میں افسانہ نگاروں کو احساس ہوا ہے کہ کہانی کے آلاؤ پہ جن بہروپیوں نے قبضہ جمایا ہے، انہینے اس کے اعتبار کو گم کیا ہے۔ اس لیے آہستہ آہستہ اردو افسانے نے روح عصر سے اپنا رشتہ جوڑا ہے۔ اور ابلاغی حرمت کو تسلیم کیا ہے۔" (۳۹)

اپنی تنقید کے اکثر مقامات میں ڈاکٹر انوار احمد صاحب تہذیب و شائستگی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ لیکن جہاں وہ دیکھتے ہیں کہ افسانے میں واقعات سے زیادہ افسانہ نگار کے تاثرات نمایاں ہو گئے ہیں وہاں وہ اردو افسانے کی راویت بیان کرنے کے دوران مفاہمتی رویہ اختیار نہیں کرتے نہ ہی وہ اردو افسانے میں لفظی گورکھ دھندے کی جز وقتی تحریک کو کسی خاطر میں لاتے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ جوگندر پال، انور زاہدی، رشید امجد، ممتاز مفتی کی افسانہ نگاری کو طنزیہ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ دراصل انوار احمد افسانے میں قصے یا کہانی پن کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ چنانچہ ممتاز مفتی کے فن پر فکر تونسوی کے طنز کو اہمیت دیتے ہیں:

"مفتی بھی ادب کے اس گڈ مڈ دور کی پیداوار ہے لیکن اس کے ذہنی اور جسمانی عناصر کے طے شدہ رجحان نے اس طوفان مشترک کو جلد ہی بھانپ لیا اور مفتی نے اپنے لیے فرائڈ کا انتخاب کر کے اپنا دامن صاف بچا لیا۔" (۴۰)

وہ رشید امجد کی افسانہ نگاری پہ لکھتے ہیں :

"انفرادیت کی آرزو میں رشید امجد کچھ عرصے کے لیے ابہام کے صحرا میں مارا مارا بھی پھرا، یہی وجہ ہے کہ 'ریت پر گرفت' کے بیشتر افسانے نئی لسانی تشکیل اور فنی معجزے دکھانے کی آرزو کے عکاس ہیں، اسی مجموعے کے بیشتر افسانے 'نثری نظم' کی تحریک سے متاثر دکھائی دیتے ہیں اور مکاشفے اور مکالمے کی آرزو سے خالی، کشف ذات کے معروف جتن لگتے ہیں۔" (۴۱)

ان اقتباسات سے واضح ہے کہ ڈاکٹر صاحب جدیدیت کے دور کو گڈ مڈ دور تصور کرتے ہیں جس نے انفرادیت کے شوق میں قاری سے اپنا رشتہ کمزور کر لیا تھا۔ وہ رشید امجد کی اس افسانہ نگاری کو 'نثری نظم' کی تحریک سے متاثر کہہ کر ملامت کرتے ہیں۔ بلکہ ڈاکٹر صاحب اس تحریک کے زیر اثر افسانہ نگاری کو اردو افسانے کے لیے ایسا زہر تصور کرتے ہیں جس سے جانبری ممکن نہیں۔ تاہم ڈاکٹر صاحب کو اطمینان ہے کہ جدید کہانی جو موجودہ عہد میں لکھی جا رہی ہے وہ ترقی پسند افسانوی روایت سے استفادہ کر رہی ہیں۔ موضوعات اگرچہ جدید ہیں، لیکن افسانے میں پھر سے کہانی پن اور بیانیہ انداز اختیار کیا جا رہا ہے۔

ترقی پسندوں کے ہاں افسانے کی بڑی شرط کہانی پن ہے۔ تاہم اگر کسی افسانہ نگار نے اس بڑی شرط کو نظر انداز کیا ہے لیکن بغاوت کی شرط کو اپنے افسانوں میں پیش نظر رکھا ہے تب بھی ایسے افسانہ نگار ڈاکٹر صاحب کے اعتبار پر پورا اترتے ہی

"میرا کی مخصوص شہرت اس کے کمپوزیشن ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، اور آخری کمپیوزیشن اور پھر کمپوزیشن موسم سرما ۴۶، اور کمپوزیشن دسمبر ۴۶ کے عنوان سے لکھے گئے افسانوں سے ہوئی۔ یہ دراصل شعوری طور پر روایتی بیانیہ افسانے کے مسلمات کو توڑتے اور پھر نئے سرے سے ایک فضا یا تاثر کمپوز کرنے کی کوشش تھی۔ مگر حیرت انگیز طور پر اس میں وہلسانی دہشت گردی نہیں

Vol.5 No.1 2022
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

ملتی جن کی بدولت افسانے کے قارئین نے بھاگ کر ڈائجسٹوں میں پناہ لی۔ یہ وہ دور ہے جب میزاویت نام جنگ کے خلاف دنیا بھر کے انصاف پسندوں کے اشتعال سے سماج کا ایک نیا منظر نامہ کمپوز کرنے کی تمنا رکھتا ہے۔" (۴۲)

انور سجاد کی کہانیوں میں بھی استعارے کا بے جا استعمال ہے لیکن ڈاکٹر صاحب انوار سجاد کے متعلق تحریر کرتے ہیں :

"انور سجاد بلاشبہ جدید اردو افسانے میں ایک رجحان کا نام ہے۔ اُس نے کہانی کے روایتی سانچے اور اسلوب کے مانوس لہجے کو شعوری طور پر توڑ کر اپنے عصر کی پیچیدہ صورت حال کے اظہار کے لیے نہ صرف نئے فنی وسائل تلاش کرنے کی کوشش کی بلکہ ایک نیا استعارہ بھی وضع کرنا چاہا۔ لیکن میرے خیال میں انور سجاد لکھنے والوں کے اس قبیلے سے تعلق رکھتا ہے جس کا نیوراتی فرد اپنی نفسیاتی الجھن، اعصاب زدگی، اور انتشار فکر و نظر کے اظہارِ پریشان کو روحصر جانتا ہے۔" (۴۳)

ڈاکٹر صاحب اسد محمد خان کے متعلق بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اسد محمد خان کو زبان کے انہدام اور ردِ تشکیل سے دلچسپی ہے اور ان کے افسانے 'سنجیدہ ہڈیائیکٹو اسٹوری' کے عنوان کو وہ کافی غیر سنجیدہ سمجھنے کے باوجود اس افسانے کے موضوع کو لائق اہمیت دیتے ہیں۔ جیسا کہ وہ لکھتے ہیں:

"تاہم یہ اقتدار کے کھیل کے اندر آرزو، فریب سازش، بے رحمی اور باخبری اور لاعلمی کے سبھی عناصر کی ڈرامائیت پر مبنی ایسا افسانہ ہے جو عزیز احمد کے 'جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں اور خدنگِ جستہ کے پائے کا ہے کہ اس میں تاریخ، تخیل اور عصری شعور سے بصیرت افروزی کا کام لیا گیا ہے۔" (۴۴)

ڈاکٹر صاحب حسن منظر کی افسانہ نگاری کے متعلق پانچ خصوصیت کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ پانچ خصوصیات ترقی پسندی کے منشور سے ہرگز باہر قدم نہیں رکھتیں اس کے باوجود حسن منظر کی افسانہ نگاری کے متعلق تحریر کرتے ہیں کہ حسن منظر کی تخلیقی صلاحیت ہمہ جہت تجربے اور مشاہدے اور اظہار کے وسائل سے مالامال ہے لیکن اُن کی کہانیوں میں ہیت اور تکنیک انھیں ایک مخصوص تصورِ حیات سے الگ نہیں کرتی۔ (۴۵) ڈاکٹر صاحب مسعود اشعر کی افسانہ نگاری کو ایک طرف اردو افسانے کی جدیدیت کی تحریک میں اردو افسانے کا اعتبار قرار دیتے ہیں اور دوسری طرف اُن کی افسانوی کائنات کو مخمصے اور تذبذب میں ڈوبتا ہوا بھی دیکھتے ہیں۔ (۴۶) سمیع آہوجا کے افسانوں میں بھی استعارے کا پیچیدہ نظام اور نئی لسانی تشکیل ملتی ہے لیکن وہ بھی ڈاکٹر صاحب کے اعتبار پر اس لیے پورے اُترتے ہیں کہ وہ بغاوت کی شرط کو پورا کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ جیسا کہ ان کے بارے میں لکھتے ہیں :

"سمیع آہوجا کا ظاہری طور پر ادبی نصب العین زبان کے مروجہ سانچے کو نذرِ تخریب کرنا ہے مگر وہ حقیقت میں تاریخ و تہذیب کی مروجہ توضیح اور تشریح پر بھی معترض ہے، وہ اپنے ایک افسانے 'قید در قید' میں جعفر زٹلی جیسے حریتِ اظہار کے قتیل شاعر کا ذکر کرتا ہے جس کی گردن میں تسمہ ڈال کر فرخ سیر نے مار دیا تھا اور اس تہذیب سے تخلیقی طور پر وابستہ اردو کے دو عظیم افسانہ نگاروں سے سوال کرتا ہے کہ وہ طاقت وروں کی منشا سے تشکیل دی جانے والی تاریخ کے روبرو کوئی باغیانہ سوال کیوں نہیں کرتے؟" (۴۷)

اسی طرح میرزا ادیب کے جذبہ حریت، اشفاق احمد کی انسان دوستی، قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں انحطاط پذیر طبقے کے مسائل پر عکاسی، انتظار حسین کی حُسن و صداقت کے اقدار کی تلاش، خالدہ حسین کے ہاں مزاحمت کا احساس اور عرش صدیقی کے تصورِ حیات کے حوالے سے فکشن

Vol.5 No.1 2022
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

مطالعات قاری کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ ان افسانہ نگاروں کا مارکسیت سے کوئی حوالہ نہیں بنتا پھر بھیانوار احمد صاحب ان کے افسانوں میں سیاسی و سماجی شعور کی حامل کہانیاں تلاش کر لیتے ہیں۔

اس مضمون کے آغاز میں راقم نے تذکرہ کیا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی یہتصنیفبنیادی طور پر دو حصوں میں منقسم ہے۔وہ اردو افسانے کو پریم چند کی روایت کی دین سمجھتے ہیں اور اسی روایت کو افسانے لکھنے والے لکھاریوں نے اختیار کیا۔ڈاکٹر صاحب اپنی اس کتاب میں روایت کے تصور کی وضاحت نہیں کرتے۔یعنی روایت کیا ہے؟وہ کس نقاد کے تصور روایت کو درست خیال کرتے ہیں؟اپنی کتاب کو پریم چند کی روایت اور روایت کا حاصل میں کیوں تقسیم کرتے ہیں؟اس بابت ہمیں کتاب میں کوئی تفصیل ہاتھ نہیں آتی۔کتاب کے آغاز میں وہ افسانے کے مفہوم کو مغربی تناظر میں بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اردو افسانے کی مختصر تاریخ بھی بیان کرتے ہیں لیکن روایت سے کیا مراد ہے کوئی عقیدہ ہے،کوئی عصبیت ہے یا کوئی مخصوص نظام ہے یا طرز احساس ہے؟اور یہ کہ روایت ماضی کی تکرار ہے یا ماضی کی باز آفرینی ہے؟اس بارے میں ابتداء میں قاری کو کوئی معلومات نہیں ملتی۔تاہم کتاب کی قرات کے بعد ہمکہہ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی روایت سے کیا مراد ہے۔روایت کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے راقم نے پہلے یہاں کچھ ماہرین کی آراء کو یکجا کیا ہے۔تنقید میں سب سے پہلے روایت کو ٹی ایس ایلیٹ نے متعارف کرایا:

"اگر روایت کے معنی یہ ہیں کہ اپنے سے پہلی نسل کے طریقوں اور کامیابیوں کا آنکھ میچ کر یا
س ہ م ے س ہ م ے ات ب اع ک ی ا ج ائ ے ت وای س ی ص ورت م ی ں ی ق ی ن اَ رو ای ت ک ی ح م ای ت س ے گ ر ی ز ک ر ن ا چ اہ ی ے۔
خود ایسے بہت سے رجحانات کو مرتے دیکھا ہے۔یہ بات مسلّم ہے کہ جدّت تکرار سے بہتر ہے۔
(۴۸)"

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہر وایت کا معاملہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔اول تو روایت وراثت میں نہیں ملتی اور اس کو حاصل کرنے کے لیے سخت کوشش کرنی پڑتی ہے اور تاریخی شعور سے ہم آہنگی ضروری ہے۔

اردو تنقید میں روایت سے متعلق وضاحت حسن عسکری،شمس الرحمان فاروقی،سلیم احمد،اور انیس ناگی کی آراء سے ہوتی ہے۔حسن عسکری کے نزدیک روایت کے معنی سمجھے بغیر ادب چل نہیں سکتا اور مغرب روایت کے معنی سمجھنے میں غلطی پر ہے۔دراصل حسن عسکری خیال کرتے ہیں کہ روایت کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کی نوعیت مستقل ہوتی ہے جبکہ ایلیٹ صاحب نے روایت کو عادت کے معنی میں لیا ہے۔عسکری صاحب نے اپنے مضمون 'روایت کیا ہے؟' میں روایت کو ایک مابعد الطبیعاتی نظام کہا ہے (۴۹) جس میں مذہب،اخلاق،فنون اور معاشرت منسلک ہوتے ہیں۔عسکری صاحب کے نزدیک اس نظام سے منسلک اصولوں کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔تاہم شمس الرحمان فاروقی سمجھتے ہیں روایت کے اندر اپنی اصلاح کر لینے کی قوت مضمر ہوتی ہے۔شمس الرحمن عسکری صاحب کے تصور روایت پر اعتراض کی وجہ اُن کے محدود تصور روایت کو ٹھہرایا اسی وجہ سے وہ اپنے تصور روایت پر خود تضادات کے بھی شکار رہے۔(۵۰)انیس ناگی ادب میں روایت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"تخلیقی فنون کے حوالے سے روایت طرز احساس کا نام ہے۔وسیع تر معانی میں طرز احساس کی اصطلاح ان تمام عناصر پر مشتمل ہے جو کسی فرد یا معاشرے کے کسی طبقے کے جذباتی رد عمل میں یک جہتی پیدا کرتے ہیں۔تمدن ایک سے زیادہ طرز احساس کا مجموعہ ہے۔روایات و تمدن وہ سوتے ہیں جن سے تخلیقی فنون کی ندیاں پھوٹتی ہیں۔فنکار روایت کے ذریعے تمدن تک پہنچتا ہے یعنی اس کے تصور تمدن میں اس کا تصور روایت اور عصبیت بھی شامل ہوتی ہے جو اُسے مخصوص نہج پر سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔"(۵۱)

اس اقتباس سے واضح ہے کہ انیس ناگی روایت کو تمدن کے متبادل خیال کرتے ہیں۔اردو تنقید میں روایت سے متعلق مختلف آراء کو دیکھ لینے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے ہاں روایت سے مراد ایک مخصوص طرز احساس ہے،جب وہ 'روایت کا حاصل' کی اصطلاح کو برتتے ہیں تو اس سے مراد محض ماضی کی تکرار نہیں بلکہ ماضی کی باز آفرینی مراد لیتے ہیں۔

Vol.5 No.1 2022
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

ڈاکٹر صاحب کو اردو کی تنقید میں ایک منفرد حیثیت رہی ہے اور وقار عظیم، وارث علوی، محمد حمید شاہد، ڈاکٹر اقبال آفاقی اور مرزا حامد بیگ جیسے ناموں کی موجودگی میں اپنی ایک الگ پہچان رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اپنی تحقیق و تنقید کی مدد سے تخلیق کار اور قاری کے درمیاں پل کا کردار ادا کرتے ہیں۔ انوار صاحبکے نزدیک یہ بات زیادہ اہم ہے کہ اردو ادب کا قاری تخلیق کار کے عندیہ تک سو فیصد پہنچے۔ اس لیے وہ ابلاغ کو اہمیت دیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اپنے ارد گرد کے ماحول سے زندگی کو دیکھنا اور سمجھنا چاہتے ہیں۔ یہ بات درست ہے کہ ڈاکٹر صاحب اپنی تنقید میں حجابات کا سہارا لیتے ہیں لیکن ان حجابات کا سہارا لینے کا مقصد اپنے دور کے زندہ سوالوں کو نظر انداز کرنا ہر گز نہیں ہے۔ اردو افسانہ سے متعلق یہ زندہ سوال خود بخود وقت کی دھول میں اپنا وجود کھو چکے ہیں۔ میری مراد جدیدیت کے اس دور سے ہے جو بیس سال منظر پر رہنے کے بعد خود ہی دھندلا گیا ہے۔ اردو ادب کا قاری دیکھتا ہے کہ کس طرح جدیدیت کا سب سے بڑا نقاد افسانہ نگاری میں جدیدیت کی نفی کرتا ہے۔ دراصل ڈاکٹر صاحب کا اردو ادب کا وسیع مطالعہ ان کے مزاج کو قطعیت، جامعیت اور استدلال کے ساتھ اپنا نقطہ نظر بیان کرنے کی قوت دیتا ہے۔ اسی لیے وہ اردو افسانہ کے اس بے جان دور پر خصوصی طور قلم اٹھانے کو وقت کا ضیاع خیال کرتے ہیں۔ تاہم وہ تقابلی اور تجزیاتی جائزہ میں اردو ادب کے اس دور کا ذکر سرسری طور پر کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس حجاب کو اختیار کر کے ایک طرف اپنے ہم عصر ناقدین میں اپنی انفرادیت کو منوایا ہے اور دوسری طرف مدرسانہ تنقید کے طعن سے اپنا دامن بچایا۔ ڈاکٹر انوار احمد صاحب اپنی کتاب کو ترقی پسند تنقید کے عمومی رویے اور معیارات کو بطور میزان اختیار کرتے ہیں۔ ان معیارات و نظریات پر مارکس کے علاوہ لینن، اینگلز اور گورکی کے اثرات نظر آتے ہیں۔ وہ ترقی پسند نظریات سے وابستہ ہوتے ہوئے ادب کو ادب کے طور پر لیتے ہیں اور فکر و نظر کی پرکھ کے باوجود فنی تقاضوں پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب افسانوی تنقید میں نثری تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ اُن کی نثر کی ادبیت کا تعلق نہ سادگی سے ہے نہ رنگینی خیال سے بلکہ یہ ادبیت تخلیقی عمل سے وجود میں آئی ہے۔ وہ تحقیق کے دوران زبان کے تمام تخلیقی امکانات کو استعمال کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب جہاں تنقید کے دوران افسانوں کے کرداروں کے سماجی مقام، آداب و رسوم اور باہمی امتیاز کا مطالعہ کرتے ہیں وہاں اُن کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ کر کے شعور اور لاشعور کی پیچیدگیاں بھی تلاش کرتے ہیں۔ ان کی رائے میں سماجی حقائق کا بیان افادیت کا پیش خیمہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے جس لگاؤ اور خلوص سے تحقیق و تنقید کی یہ ذمہ داری نبھائی ہے وہ اردو ادب سے ان کے گہرے وسیع دلی لگاؤ کو عیاں کرتی ہے۔ ان کے جانچنے اور پرکھنے کا عمل پڑھنے والے کی سوچ اور فکر کو نئے راستوں سے ہمکنار کرتی ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالہ جات:

۱۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو افسانہ اور افسانہ نگار (نئی دلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۸۴ء)، ص ۱۳۔

۲۔ انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ۔ ایک صدی کا قصہ (ملتان: کتاب نگر پبلشر، ۲۰۱۷ء)، ص ۱۹۔

۳۔ ایضاً، ص ۲۶۔

۴۔ ایضاً، ص ۳۳۔

۵۔ ایضاً، ص ۳۳۸۔

۶۔ ایضاً، ص ۶۸۹۔

۷۔ انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ۔ ایک صدی کا قصہ، ص ۱۹۹۔

۸۔ انوار احمد، ڈاکٹر، "وعدہ خلافی" (زود پشیماں!)، مشمولہ: روزنامہ دنیا، (لاہور: ۱۶ نومبر ۲۰۱۲ء)

۹۔ گیان چند جین، ڈاکٹر، تحقیق کا فن، (لاہور: فکشن ہاؤس۔ ۲۰۱۴ء)، ص ۲۵۔

۱۰۔ انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ۔ ایک صدی کا قصہ، ص ۱۸۔

۱۱۔ ایضاً، ص ۳۷۔

Vol.5 No.1 2022
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

۱۲۔ ایضاً،ص۳۸۔

۱۳۔ ایضاً،ص۴۷۰۔

۱۴۔ ایضاً،ص۳۰۰۔

۱۵۔ ایضاً،ص۵۱۸۔

۱۶۔ ایضاً،ص۵۰۹۔

۱۷۔ ایضاً،ص۳۳۸۔

۱۸۔ ایضاً،ص۴۴۔

۱۹۔ ایضاً،ص۴۲۹۔

۲۰۔ ایضاً،ص۸۹۔

۲۱۔ انواراحمد،ڈاکٹر،اردو افسانہ۔ ایک صدی کا قصہ(نئی دلی: براؤن بک پبلی کیشنز،۲۰۱۴ء)،پاورقی۔

۲۲۔ ایضاً،ص۱۱۵۔

۲۳۔ ایضاً،ص۳۴۷۔

۲۴۔ عبادت بریلوی،ڈاکٹر،اقبال کی اردو نثر،(لاہور: مجلس ترقی ادب،۱۹۷۷ء)،ص۹۔

۲۵۔ انواراحمد،ڈاکٹر،اردو افسانہ۔ ایک صدی کا قصہ،ص۲۷۔

۲۶۔ جدید تر کہانی،مشمولہ: نیا افسانہ۔ میلانات و مسائل،مرتبہ:ڈاکٹر قمر رئیس(دہلی: مطبوعات اردو اکادمی،۱۹۹۲ء)،ص۱۴۲۔

۲۷۔ انواراحمد،ڈاکٹر،اردو افسانہ۔ ایک صدی کا قصہ،(ملتان: کتاب نگر پبلشر،۲۰۱۷ء)،ص۴۴۔

۲۸۔ ایضاً،ص۷۷۔

۲۹۔ مارکسی تنقید،مشمولہ: پاکستانی ادب تنقید،مرتبہ: رشید امجد(روالپنڈی: فیڈرل گورنمنٹ سرسید کالج،۱۹۸۲ء)،ص۸۳۔

۳۰۔ انواراحمد،ڈاکٹر،اردو افسانہ۔ ایک صدی کا قصہ،(ملتان: کتاب نگر پبلشر،۲۰۱۷ء)،ص۳۱۔

۳۱۔ ایضاً،ص۳۴۸۔

۳۲۔ ایضاً،ص۳۴۵۔

۳۳۔ ایضاً،ص۱۴۳۔

۳۴۔ ایضاً،ص۲۳۴۔

۳۵۔ ایضاً،ص۵۳۱۔

۳۶۔ شمس الرحمن فاروقی،ڈاکٹر،افسانے کی حمایت میں(دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،۲۰۰۶ء)،ص۲۰:۱۴۔

۳۷۔ "جدید تر کہانی"،مشمولہ: نیا افسانہ۔ میلانات و مسائل،مرتبہ: قمر رئیس(دہلی: مطبوعات اردو اکادمی،۱۹۹۲ء)،ص۱۴۵۔

۳۸۔ "نیا افسانہ۔روایت سے انحراف اور مقلدین کے لیے لمحہ فکریہ"،مشمولہ :اردو افسانہ روایت و مسائل ،مرتبہ: گوپی چند نارنگ (دہلی: ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس،۲۰۱۳ء)،ص۴۲۷۔

۳۹۔ انواراحمد،ڈاکٹر،اردو افسانہ۔ ایک صدی کا قصہ(ملتان: کتاب نگر پبلشر،۲۰۱۷ء)،ص۳۱۔

۴۰۔ ایضاً،ص۵۰۰۔

۴۱۔ ایضاً،ص۵۹۲۔

۴۲۔ ایضاً،ص۵۲۹۔

Vol.5 No.1 2022
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

۴۳۔ ایضاً،ص۶۰۸۔

۴۴۔ ایضاً،ص۵۷۹۔

۴۵۔ ایضاً،ص۵۸۸۔

۴۶۔ ایضاً،ص۶۱۷۔

۴۷۔ ایضاً،ص۶۲۶۔

۴۸۔ جمیل جالبی(مترجم)،ٹی ایس ایلیٹ، ایلیٹ کے مضامین(لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز۔۲۰۰۲ء)،ص۱۸۴۔

۴۹۔ محمد حسن عسکری،مجموعہ(لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۸ء)،ص۶۳۴۔

۵۰۔ شمس الرحمن فاروقی،ڈاکٹر،مشمولہ:محمد حسن عسکری اور معاصر تنقید،مرتبہ: اشتیاق احمد(لاہور: بیت الحکمت، ۲۰۰۸ء)،ص۳۱۶۔

۵۱۔ انیس ناگی،نیا شعری افق(لاہور: جمالیات،۱۹۸۸ء)،ص۲۔